محمد صادق ضیا

اسی مصنّف کے قلم سے

شب چراغ

عورتیں کہتی ہیں یہ افسانے ہماری تہذیب و تسکین کے لئے لکھے گئے ہیں۔ لیکن مردوں کی زبان میں، مرد کہتے ہیں کہ ان افسانوں میں ہماری اخلاقی، مجلسی، ازدواجی اور رومانی زندگی کی تصویر ہے۔ غرضکہ یہ افسانے بالاتفاق سب کو پسند ہیں۔ "جو سنتا ہے اُسی کی داستان معلوم ہوتی ہے" نفسیاتِ زندگی کی تحلیل ان افسانوں میں بدرجہ اتم کی گئی ہے۔ اور کوئی افسانہ ایسا نہیں جو باعتبار واقعات و افسانویت دلنشیں اور دلچسپ نہ ہو۔ یہ مجموعہ حال ہی میں طبع ہوا ہے اور ہاتھوں ہاتھ نکل رہا ہے۔ آپ بھی ایک جلد طلب فرمائیے۔

قیمت فی جلد آٹھ آنے (۸/)

حُسن کار

فنونِ لطیفہ پر ایک سیر حاصل بحث۔ شاعری مصوری، موسیقی، اور تعمیر کے متعلق معلومات و نظریات کا ایک نقشِ جمیل۔ کتاب کی زبان بجائے خود ایک آرٹ۔ طلبائے مدارس کے لئے عموماً اور آرٹ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے خصوصاً قابلِ مطالعہ۔ اخبارات اور رسالوں نے اس کتاب پر نہایت حوصلہ افزا ریویو کئے ہیں۔ تین دیباچے، مرزا انجم آفندی اکبر آبادی، مرزا عظیم بیگ چغتائی۔ بی۔ اے اور پروفیسر احمد علی۔ ایم۔ اے کے قلم سے مع تصویرِ مصنف شریکِ کتاب ہیں۔

قیمت ۶/ علاوہ محصول

ملنے کا پتہ

مکتبۂ قصر الادب آگرہ

عصرِ نو
محمد صادق ضیا

اشاعت گاہ

مکتبۂ قصر الادب دفتر "شاعر" آگرہ

بار اول ۱۰۰۰

جنوری سنہ ۱۹۴۰ء

قیمت ۴؍

۷۸۶

مقدمہ

عصرِ نو، عصرِ نو کے ایک نوجوان شاعر میاں محمد صادق قیبانی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی
وکیل آگرہ کی فکرِ جمیل کی ایک نئی انگڑائی ہے۔

پیشتر اسکے کہ میں نظم "عصرِ نو" کی معنوی خصوصیات یا نفسِ مضمون کی تازگی اور اہمیت پر کچھ کہنے کی
جرأت کروں، میں یہ عرض کر دینا ضروری تصور کرتا ہوں کہ میرے نزدیک "ادبیاتِ عالیہ" کے دو پہلو
ہیں۔ ایک وہ جس کا مطالعہ ہم میں زندگی کے جذبات پیدا کرے اور دوسرا جو ہمیں نئی نئی معلومات سے
بہرہ ور کرے، بعض اربابِ فکر و نظر نے ان میں تغزلی لٹریچر اور ادبیاتِ عامہ (Democratic
Literature) کا بھی اضافہ کر کے بزعمِ خویش ادبیاتِ عالیہ کی جولانگاہ کو وسعت
دینے کی سعی کی ہے لیکن میری ناقص رائے میں آخری دونوں انواع اتنی بلند مرتبہ نہیں کہ ان کو

ادبیاتِ عالیہ میں شامل کیا جا سکے۔

نظم "عصرِ نو" ایک خالص معلوماتی چیز ہے۔ عصرِ حاضر کی جملہ خصوصیات، تہذیب جدید کے ارتقار اور رجحانات پر سیرانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے لیکن اس التزام کے ساتھ کہ شاعری کا حق بھی ادا ہو گیا ہے —— تمام نظم چست، موجز مگر مکمل، مربوط، برجستہ اور نہایت پختہ ہے اور اس قابل ہے کہ نوجوان شاعر اسے جائز فخر و مباہات کے ساتھ اربابِ ذوق کی خدمت میں پیش کر سکے، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ نفسِ مضمون نہایت اہم ہے اور اس اعتبار سے نظم کی معنوی خصوصیات جدت اور تنوع کے سبب بہت بلند ہیں۔

—— جہاں تک معنوی خصوصیات کا تعلق ہے۔ ان کا فیصلہ قارئین کرام پر چھوڑا جاتا ہے۔ کیونکہ "نقش" "خود" "شوخیٔ تحریر" کا "فریادی" ہے نیز نفسِ مضمون اتنا اہم ہے کہ اس پر کچھ عرض کرنا میرے نزدیک اس سے کہیں زیادہ ضروری ہے کہ اشعار کی چستیٔ تراکیب، اور جزالتِ بیان پر غلغلۂ تحسین بلند کر کے نفسِ مضمون کی اہمیت کا نہایت "آسانی" سے خون کر دیا جائے۔

نفسِ مضمون کا پس منظر

زندگی اپنی نمود میں لاتعین ہے اور تقاضائے حیات ہے ارتقار، اور نشو و نما، بدوِ آفرینش سے تمام ادوار اگر انسان کے تاریخی ادوار۔ شکار[1]، گلہ بانی[2]، زراعت[3] اور سلطنت ([illegible]) پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ دورِ حاضرہ ارتقار کے لحاظ سے پچھلے تمام ادوار پر لامحدود فوقیت کا حامل ہے کیونکہ اس دور کے میدان علم و عمل میں (سائنس۔ فلسفہ، حکمت، لٹریچر وغیرہ) انسان کی ترقی اسقدر حیرت انگیز ہے کہ گزشتہ تمام ادوار میں اس کا عشرِ عشیر بھی حضرتِ انسان کو نصیب نہیں ہو سکا، لیکن وہ

جو کسی نے کہا ہے ابتلاء اور ارتقاء کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے اسکے بمصداق جس طور یہ دورِ علم و فن میں انتہائے عروج کا ضامن ہے اسی طرح کمالِ ابتلاء کا بھی حامل ہے ——
میری مراد دورِ سلطنت کی ان ہنگامہ آفریں خصوصیات سے ہے جو عالمِ امکاں کے لئے سخت آزمائش کا باعث ہوتی ہیں - ان کا ادنیٰ سا کرشمہ بلکہ "دھویا ہوا خاکا" یہ ہے کہ تخت و تاج کے گرد اُمراء و وزراء افواج و متعلقین کی ایک جماعت ہو جاتی ہے جس کے تحت میں رعایا کے درجہ بدرجہ طبقات بنا دیئے جاتے ہیں۔ سارے ملک کی محنت تاج کی خدمت میں لگا دی جاتی ہے۔ "دہ خدا" کے لئے زمین سونا اگلنے لگتی ہے لیکن غریب کاشتکار کے نانِ شبینہ کی بھی کفیل نہیں ہوتی، **قوی و کمزور کے تنازع البقاء** میں "بقائے بہترین" کا ظالمانہ اصول کارفرما بن جاتا ہے۔ اس طاغوتِ اعظم کے زیرِ سایہ نہ صحیح خیالات پیدا ہو سکتے ہیں اور اگر بدقسمتی سے پیدا ہو بھی جائیں تو فروغ پانا معلوم —— سچے دین اور مکمل روحانیت کی تربیت تو کجا تبلیغ تک کے خیالات کا گزر بھوک کی ماری ہوئی مخلوق کے مفلوج دماغوں میں نہیں ہوتا کیونکہ سلطنت کی بے پناہ قوتیں کسی نہ کسی غرفے سے چشمِ ہرن کی طرح ایسی جدوجہد کا بغور مطالعہ کرتی رہتی ہیں جو انکے نزدیک کسی طرح انکے بنائے ہوئے توں کی خدائی کا بطلان کرنے کا شائبہ تک بھی اپنے قرآن میں لئے ہو —— اسلام نے قیصریت اور کسرویت کے طواغیتِ کبریٰ کو ضربِ اللہ اکبر سے پاش پاش تو کر دیا لیکن فتوحات کے سیلاب، خزائن اور نادر صنائع کی بہتات اور حکومت اور نہ معلوم کن وجوہات اور ترغیبات (؟) کے زیرِ اثر خود مسلمان شخصی حکومت کے تخت پر آ گئے اور سلطنت کے پرستار بن گئے۔ نتیجۃً دنیائے عصر پر وہی "تمیزِ خواجہ و بندہ" لعنت کا طوق بنکر نوعِ انسانی کے گلے کا ہار ہو گئی، —— لیکن زندگی بقولِ عارفِ ہندیؒ "انجمن آرا و نگہدارِ خود" ہونے کا تمغۂ امتیاز

رکھی ہے۔ زمانے کی کروٹ نے تخت پر بیٹھنے والوں کو خاک نشیں کر کے جہاں اربابِ نظر کو درسِ عبرت دیا وہیں اتنا بھی کر دیا کہ "سلطنت کی ناکامیابی سب پر اظہر من الشمس ہوگئی۔

——— صد شکر، کہ اب دورِ "سلطنت" ختم ہو رہا ہے اور عصرِ نو کا خورشید افقِ طلوع سے آہستہ آہستہ بلند ہو کر "سلطنت" کی خونیں شام پر تجسس و تحقر آمیز نگاہیں ڈالتا اس خونیں ڈرامے کے آخری مناظر دنیا کو ایک نئے رنگ روپ میں دکھا رہا ہے جو شائد اصلی ہے ———

یہیں سے یہ نظم شروع ہوتی ہے اور عہدِ نو کے آفتاب کے رفتہ رفتہ بڑھنے کے ساتھ ساتھ خود بھی چمنِ ندرت کے شبنم پوش پھولوں پر قدم رکھتی ہوئی عصرِ نو کی جملہ خصوصیات پر لطیف نظریں ڈالتی ہوئی مستقبل کی آئینہ پوش تجلیات میں گم ہو جاتی ہے ———!

عصرِ نو کی خصوصیات

ارتقائے حیات کے اس نئے دور کی بڑی خصوصیت فی الحقیقت وہ نظریات ہیں، جو نظریہ سلطنت ([illegible]) کے مقابلہ میں کسی آئینی (Constitutional) کارروائی سے عالمِ امکاں میں قیامِ امن کے لئے وضع کئے گئے ہیں! یہ سب کے سب اِلّا ماشاء اللہ نظریۂ سلطنت ([illegible]) کی ضِد ہیں۔ میں نے "قیامِ امن" کے الفاظ سے تخصیص بدیں وجہ کی ہے۔ کہ فی الحقیقت کسی قسم کی حکومت کا یا روئے زمین پر "نیابت الٰہی" کا مقصدِ اوّلیں اور فرضِ منصبی قیامِ امن ہے، اور نفاق، افتراق، فساد، اور اشتقاق کی جڑ کاٹنا ——— نظریۂ سلطنت کی عالمگیر رواروی کے بعد اس کی جگہ لینے کے لئے "قصرِ انسانیت" سے جو "نئے بت ڈھل کر" باہر نکلے ہیں وہ فسطائیت، آمریت یا قائدیت

جمہوریت اور اشتراکیت ہیں، نیز ملوکیت ـــــ بھی ان میں شریک ہو کر پانچوں سواروں میں ملنا چاہتی ہے۔ دوسری خصوصیت اس دور کی بیداریٔ عامہ ہے۔ جس کی تعبیر شاعر نے "اختلاج و احتجاج" کے جامع الفاظ میں نہایت خوبصورتی سے بیان کی ہے۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ جب چمن زارِ ہستی میں خموشی کے معنی موت ہوں اور شورِ مسلسل کا مفہوم جذبۂ حیات انگیز! ......

ملاحظہ فرمائیے شاعر نے کس طرح اس کی نقاشی کی ہے ؎

آج اس دنیا میں خاموشی کے معنی موت ہیں! آج بیداری کے معنی اختلاج و احتجاج!

انقلاب انگیز ہے شورِ مسلسل کی گرج اب نہیبِ صُور سے ملتی ہے بادل کی گرج!

تیسری خصوصیت اس دور کی نوجوان اور عالمِ نوجوانی کی بڑھتی ہوئی اہمیت ہے۔ آج جس ملک کے نوجوان بیدار و مستعد ہیں وہی ملک ترقی کے میدان میں سب سے آگے قدم مارتا نظر آتا ہے یہی وجہ ہے کہ نوجوانوں کے "سرمایۂ محفوظ" میں وہ قوت نہاں ہے کہ ؎

یہ اگر چاہیں اُلٹ دیں تختۂ گیتی ابھی

ان کے ہاتھوں میں ہی دُنیا کا نظامِ ہست و بود

ان کے ذہن پر آج ارتقا کی تمام رموز روشن ہیں اور اسی لئے "قابلِ نازش ہے ان کے دم سے یہ بزمِ شہود!" ـــــ اسی باعث شاعر جہاں ان کی بڑھتی ہوئی اہمیت کو واضح کرتا ہے ہیں ان کی بقائے دوام کا بھی متمنی ہے ؎

ان سے قوت پا رہا ہے ملک و ملت کا سواد

نوجواں پائندہ باد و نوجوانی زندہ باد!

اب اگر نوجوانوں کی ندرتِ فکر اور جذبہ عمل کو محفلِ صورت میں جلوہ گر کرتے کرتے نوجوان شاعر کی روح خوشی سے ناچ کر جائز فخر سے ضمناً اپنے عزائم بھی بیان کر دے تو میرا خیال ہے کہ یہی موقع ہے۔ عارفِ ہندیؒ کے "اے کہ قافلہ بے ہمہ شو باہمہ رو!" کا ——— !

اسی طرح عالمِ نسوانی کی بیداری اور ان کی روزافزوں اہمیت آج اربابِ دانش پر آئینہ ہے۔ تمام آزاد ممالک میں عموماً اور جمہوریہ روسیہ میں خصوصاً عورت "دورِ شکار و گلہ بانی" کی مثل پھر آجکل حیاتِ انسانی کے تمام شعبوں میں دخیل ہے۔ اور اپنے آپ کو تنازع اللبقاء سے لیکر حکومت تک کے کاموں میں اسی طرح مختار سمجھتی ہے جس طرح صنفِ قوی صدیوں سے اپنے آپ کو انکا مکمل اجارہ دار کہتی آئی ہے ——— عورت کا وجود غرضکہ آجکل ہر جگہ ناگزیر سمجھا جا رہا ہے۔ اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ "فطرت نسوانیت" آج اسی طرح حریت افروز ہے۔ جس طرح نوجوانوں کے خونِ گرم کے شرارے جادۂ آزادی و ارتقار کو روشن کر رہے ہیں! ———

اس قدر بیان کر چکنے کے بعد اب ہم یکے بعد دیگرے ان تمام نظریاتِ حکومت پر ایک اجمالی سی نظر ڈالیں گے جنکا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے اور یہ متعین کرنے کی کوشش کریں گے کہ آیا ان نظریات نے جو بظاہر نظریہ سلطنت میں "تربیت یافتہ آئین" کا حکم رکھتے ہیں۔ عالمِ ہست و بود میں قیامِ امن کے لئے وہ کچھ کیا ہے جو نظریہ سلطنت کے تبعین سے بمجبوری یا دانستہ نہ ہو سکا؟ ———

(سرمایہ اور مزدور کی کشمکش کا بیان سب سے مقدم مناسب ہے اسلئے کہ دورِ حاضرہ کے

بعض اہم نظریاتِ حکومت اسی کشمکشِ دیرینہ سے بالواسطہ یا بلاواسطہ متعلق ہیں۔) ——

سرمایہ دار و مزدور کی کشمکش اس دور کی باقیات الصالحات میں سے ہے جیسے "عمومیت دستکاری" (mass industrialization) کے صدقے "خونِ رگِ مزدور" سے "لعلِ ناب" بنانے شروع کئے، سالہا سال تک سرمایہ داروں کی جنگِ زرگری کے طفیل مزدور کی برات "شاخِ آہو" پر رہی۔ خواجگی کے ساختہ مسکرات کے زیرِ اثر صدیوں تک یہ بدنصیب "نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ" کے پیچ و خم میں اُلجھا رہا۔ لیکن تابکے؟ آج عارف ہندی کی پیشگوئی حرف بحرف پوری ہو رہی ہے کہ "مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے!" —— اس "کرمکِ ناداں" نے "طوافِ شمع سے آزاد ہو کر اپنی فطرت کے تجلّی زار میں آباد" ہونے کے لئے جو قدم اُٹھائے ہیں وہ ایک طویل ڈرامہ ہے جس کے "عناصر اربعہ" —— "خاک و خون" اور "شکست و ریخت" ہیں، اب جاکر اتنی قربانیوں کے بعد کہیں مزدور کے "تیوروں کی برہمی" نے یہ رنگ دکھایا ہے۔

قوتِ سرمایہ داری میں ہے پیدا انحطاط!

چنانچہ اب شمع انجمن مزدور کی ضرب المثل "نامرادی" ہے سرمایہ دار کی قدیمی "حیلہ گری" نہیں۔

"ہر نئی تحریک میں یہ ہے شریکِ لازمی!"

اشتراکیت

اشتراکیت، مزدور کی جدّ و جہد کی منظم صورت کا آئینی نام ہے

اس کا تار و پود تین منفی جاذبوں (Negative Forces) پر مشتمل ہے۔ نہ تاج، نہ سرمایہ نہ مذہب! اور مزدوروں نے اس نفی، اس "ضربت لا" پر جس شدت سے کاربندی کی ہے۔ وہ تعلیم یافتہ حضرات کی نگاہوں سے مخفی نہیں۔ ملّتِ روسیہ کا خونیں انقلاب (۱۹۱۷ء) مزدوروں کی اس "تنگ آمد بجنگ آمد" کی عملی تفسیر تھی جس میں سرمایہ داری شخصی ملکیت، خواجگی، اور شہنشاہیت پر نفی کے بحران .... میں جو کچھ کیا گیا وہ رہتی دنیا تک "احتیاج و احتجاج" کا منفرد کارنامہ رہے گا، مزدور نے اپنی ظلمتوں کا خود پردہ چاک کیا اور رزمگاہ ہست و بود میں وہ کچھ کر دکھایا جکا وہم سرمایہ داروں کو کبھی خواب میں بھی نہ آیا تھا، اشتراکیت خاص انسانیت کے حقوق میں کسی قسم کے امتیاز کی حامل نہیں ہو سکتی۔ خواہ وہ حقوق ضروریاتِ ہستی (necessities of life) سے متعلق ہوں۔ یا عشرتِ خاصان سے (luxuries) اشتراک کی بدولت آج مزدوروں کی یہ حالت ہے کہ ملّتِ روسیہ دنیا کے دُولِ عظام میں شمار ہوتی ہے۔ اور اسی لئے ع

"آج ہے مزدور کے قدموں کی مٹی خاکِ پاک!"

جمہوریت ری پبلک کو اگر ایک طرف "بہترین طرزِ حکومت" کا اعزاز حاصل ہے تو دوسری طرف اہلِ نظر اسے "استبدادِ مطلق" کی حنوط شدہ ممی سے تعبیر کرتے ہیں۔ عارفِ ہندیؒ بھی دوسرے گروہ سے متعلق ہو کر "کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید" کا فتویٰ دے گئے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ

جمہوریت بایں ہمہ کہ اُس کی بنیاد رواداری، مساوات، برابری، اور اخوت پر ہے، آخر اس قدر ملعون کیوں ٹھہرائی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آجتک دنیا میں حقیقی جمہوریت قائم ہی نہیں رہ سکی۔ افلاطون کی مجوزہ ری پبلک کو محض خیال و تمثیل کا رتبہ حاصل ہے باقی عام طور پر دنیا میں رواداری اور اخوت و مساوات کی جتنی آوازیں اُٹھیں ہیں وہ کمزوروں کی آوازیں تھیں جو غلبہ حاصل کرتے ہی اُسی طرح مائلِ استبداد ہو گئیں جس طرح ان کے شاہی پیشرو۔ "انقلاب فرانس" بڑے خوش کن دعاوی اور دل پسند اصولوں کے اعلان سے شروع ہوا مگر تھوڑے ہی عرصہ میں جمہوریت، اور آئین پسندی فطرتِ انسانی کے سامنے دب گئی"۔ تمام مخلوق میں پبلک اور سیاسی امور کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اس لئے نامناسب نمائندگی اور غلط تفہیم کی وجہ سے جو تہذیب فروغ پاتی ہے وہ دوئم درجہ کی ترقی ہے۔ رُوسو کہتا ہے کہ آجتک دنیا میں جمہوریت نہ قائم ہو سکی ہے نہ شاید ہو سکے، کیونکہ یہ قانونِ فطرت کے خلاف ہے کہ اکثریت حکمرانی کرنے اور اقلیت منہ دیکھا کرے، اسی لئے فیصلہ ہے کہ دنیا میں کوئی طرزِ حکومت خانہ جنگیوں، سازشوں اور فرقہ بندیوں کا اتنا بڑا مرکز نہیں، جتنی کہ جمہوریت، کیونکہ جمہوریت "دیوتاؤں کے لئے سازگار ہے۔ ہم ایسے انسانوں کے لئے نہیں!"

قائدیت — معلوم نہیں کہ جمہوریت کا منتہاہی قائدیت کے واسطے راستہ صاف کرنا ہے یا جمہور پرستوں کے ذہن و ادراک کا نقص ہی اس چیز کا ذمہ دار بن جاتا ہے

کہ جہاں کہیں جمہوریت نے قدم جمائے، قائدیت لامحالہ آموجود ہوئی۔ جرمنی، اٹلی، روس، فرانس کی قدیم و جدید تاریخ اس کی شاہد ہیں۔ اس لئے بعض اربابِ فکر نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ "جمہوریت قائدیت کی غیر تربیت یافتہ شکل کا نام" ہے۔ قائد کی حالت اصل میں خود مختار بادشاہ (Autocrat) کی سی ہوتی ہے۔ جس کی رضا قانون کا جامہ پہن کر رعایا پر مسلّط ہو جاتی ہے۔ قائدیت کی کامرانی کی "سنہری کنجیاں" "سنسنی" اور "مصروفیت" ہیں اپنی قائدیت کے استحکام و استقلال کی خاطر قائد کا یہ نظریہ ہوتا ہے کہ "زندگی کا چاہئے آٹھوں پہر گردش میں جام!" ——— یعنی جبتک وہ جمہور کو سنسنی خیز تقاریر و احکامات سے ہنگامہ پرستی اور مشغولیت کا درس دیتے رہیں۔ اُسی وقت تک وہ محفوظ ہیں۔ ورنہ اسکے "ستارے کی ضو افگنی" دم بھر میں "نعرۂ بیداریٔ جمہوریت" کی عرش پیما لہروں میں گم ہو جاتی ہے۔ اس لحاظ سے۔

"اک کھلونا ہیں فقط اس کی نگاہوں میں عوام!"

اس لئے "امن و جنگ" "قائد کی رضا و غضب" کا دوسرا نام ہیں ؎

وہ ہے سرخوش تو زمانے پہ ہے طاری سرخوشی   اس سے وابستہ ہے یہ شادابیٔ دشت و چمن

لیکن مشکل یہ ہے کہ قائد کی عینِ حیات تک "یہ طمطراقِ ما و من" قائم رہتا ہے۔ اور اسکے بعد "پھر وہی پاؤں وہی خارِ مغیلاں" "مقسومِ دنیائے زمانہ بن جاتے ہیں ——— یعنی "جمہوریت و قائدیت دست و گریباں ہیں!" لیکن یہ تیقن ہے کہ قائد کا جذبۂ فکر و عمل قوم میں زندگی کی ایک خاص لہر دوڑانے کا موجب بنجاتا ہے۔ موجودہ دور میں ترکی اور جرمنی میں قائدیت نے جو اہم فوائد

قومی نقطۂ نگاہ سے لباسِ مجاز میں جلوہ گر کیے ہیں وہ قابلِ صد ستائش ہیں ———

لیکن اگر جمہوریت کو اپنی خودداری کا پاس ہو تو قائدکے بھی "حواس ٹھیک کرنے میں کوئی دیر نہیں لگتی"!

شاعر کے سامنے بھی قائدیت اور جمہوریت کے اختلافات ہیں۔ ایک کی چیرہ دستیاں اور دوسر کی خاموش فریادیں اُس کے دل سے قریب تر ہیں۔ لیکن وہ مایوس نہیں۔ بلکہ متفقانہ انداز سے یوں گویا ہے کہ ؎

ایک مدت سے سیاست کا یہی دستور رہے
ہیں کبھی روشن امیدیں اور کبھی ظلماتِ یاس
ہوتی آئی ہے یہاں تخریب بھی تعمیر بھی
ہے کبھی کھیتوں میں گلشن اور کبھی اُگتی ہے گھاس
آشیانہ ہے کبھی لازم کبھی کنجِ قفس
عالمِ اضداد ہے گلزارِ عالم اور بس!

باقی رہی فاسیت تو یہ صرف سرمایہ داری اور قائدیت کی ایک منجھی ہوئی شکل کا نام ہے۔ اس کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ "مزدور کلاس کو دبا کر طبقۂ اعلیٰ کے مفاد عامہ کی حفاظت کیجائے اس لئے اس کی اپیل صرف اس طبقہ تک ہے جو نوجوان اور خود سرہے نیز اپنی اعلیٰ اور ارفع پوزیشن کے لئے مزدور طبقہ کا مرہونِ منت ہے ——— ہلڈرک کوز نرز کے یہ الفاظ اتنے جامع ہیں کہ اُن پر کسی قسم کا اضافہ مشکل نظر آتا ہے۔ اس لئے امن کُشی میں فاسیت کا ہاتھ اتنا ظاہر ہے کہ اُس پر

کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں!

ملخص: مندرجہ بالا تمام نظریاتِ حکومت یا "مذاہب سیاست" کا مقصدِ امنِ عامہ کی حفاظت ہی ہے جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ابھی مہذب انسان جنگ کو الوداع کہنے سے ہچکچاتا ہے۔ اسکی تہ میں وہی پرانا جذبہ "حرص و ہوس" کارفرما ہے۔ جو آج تک خود غرض اقوام کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ شائد "پابندیٔ قوم و وطن" بھی اس معاملے میں اربابِ ہوس کا دست راست بنی رہی ہے۔ "ازمنۂ قدیم سے مختلف تہذیبوں کے عروج و زوال نے یہ خیال پیدا کر دیا ہے۔ کہ شکست و ریخت انسانی سوسائٹی کا لازمہ ہے"۔ لیکن اربابِ فکر اس تشائم نظریے کے پہلو بہ پہلو اس چیز کو فراموش کر گئے ہیں کہ یہی شکست و ریخت کسی بڑی اور مستقل تعمیر کا پیش خیمہ ہے۔ کائنات میں یہ حرب و ضرب، شورشِ انقلاب، تغیر و تبدل، سب کچھ تکمیل روحانیت اور اتمامِ نور کے لئے ہو رہا ہے۔ اگرچہ آجکل مادیت بیدار اور روحانیت خواب میں ہے اور نظریے خواہ اشتراکی ہوں یا فسطائی، جمہوری ہوں یا ملوکیت پرستانہ سب کا منتہا حقِ انسانیت کا انکشاف ہے!—— اس لئے شاعر کی یہ آرزو نہایت برمحل ہے کہ ؎

کاش دنیا میں مرتب ہو کوئی ایسا وفاق
دُور کر دے جو جدائی سے نفاق و افتراق!

جنگ و غا۔ بھی اسی تکمیلِ انسانیت کی ایک کڑی ہے لیکن متمدن قومیں باہمہ ادعائے تہذیب و تمدن اب بھی اپنی بربریت میں قرون اولیٰ کی چغلی کھاتی ہیں۔ سائنس نے جہاں زندگی کے تمام شعبوں کو ایجادات و اختراعات سے سہولت و آسائش کا مرکز بنا دیا ہے وہیں اس "تعمیر" کے سائے میں "تخریب"

کی مد میں بھی وہ گل کھلائے ہیں کہ الامان والحفیظ! آلاتِ حرب و ضرب، زہریلی گیس، تیز رفتار انجن اور مشینیں (Flammen Werfers) (Flame throwers) ٹینک، ہوائی جہاز، تارپیڈو اور نہ معلوم کن کن خرافات سے امنِ عامہ کی دھجیاں فضائے آسمانی اور اقصائے عالم میں بکھیرنے کی کوشش بلیغ کی ہے ——— یعنی ان متمدن جانوروں نے کمزور قوموں کے لئے عرصۂ حیات بصد کوشش تنگ کر دیا ہے اور غلامی کو تہذیب کے پردے میں رائج کر کے زیردستوں پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ

اب نہ یہ محفل کی زینت ہیں نہ یہ دلدارِ دوش
عصرِ نو میں انکی ہستی ہے فقط اک بارِ دوش!

جنگ خواہ ملک گیری کی خاطر ہو یا حق و صداقت کی حمایت میں اس کا لازمی نتیجہ مطلق بربادی اور مکمل تباہی ہے۔ اسی لئے اربابِ نظر کہتے ہیں کہ "جنگ انسانی سوسائٹی کے ارتقا میں کوئی لازمی کڑی نہیں!" بلکہ اسکے برعکس "جنگ کا نشو و نما، طبقہ، حکومت کے ساتھ ہوا۔ شخصی ملکیت اور ذاتی اثر و اقتدار کے جذبات طبقۂ حاکمین کے ساتھ ساتھ پھلے پھولے۔ صاحبِ اثر و اقتدار ہونے اور زیادہ قوت کی خواہشمندی نے ہی لامحالہ طور پر حرب و ضرب کی نشو و نما میں ایک نمایاں حصہ لیا ہے"۔
نتیجہ یہ ہے کہ فتحمند قومیں "بقائے بہترین" کے بزعمِ خود غلط اصول کے زیر اثر جو تاریخ مرتب کرتی ہیں اور اپنے بہیمانہ کارناموں کی توضیح و توجیہہ جس انداز سے کرتی ہیں۔ وہ آنے والی قوموں کے لئے اس جادہ پر گامزن ہونے کے لئے ایک سند بن جاتی ہے۔ اس لئے جبتک ذہنِ انسانی پر یہ دو چیزیں

مسلط رہیں گی، کہ "بقائے بہترین" کا اصول فطرتی طور پر کائنات میں کارفرما ہے اور یہ کہ جنگ و غا ارتقائے حیات کا لازمہ ہیں اسوقت تک ایک نئے اور مکمل وفاق کی امید جو محفلِ عالم سے افتراق و نفاق کو دور کرکے حق و انصاف کو رائج کرسے، فضول ہے، یہی وجہ ہے کہ موجودہ جگر پاش بر مہیوں مہیب جنگوں اور امن و انسانیت، تہذیب و جمہوریت کے نام پر خون کی ہولیوں سے

انتظارِ نورِ خورشیدِ ترقی ہے عبث!

کیونکہ سب دیکھ رہے ہیں کہ جہاں تک ملوکیت و اشتراکیت کا تعلق ہے عارف ہندی رح کا فرمان قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہے کہ

زندگی ایں را خروج آں را خراج

درمیاں ایں دو سنگ آدم زجاج!

اس لئے ان سے قیامِ امن کی امید فضول ہے۔ باقی رہا فاسیت اور فاشیت تو وہ پہلے ہی "جمہوری قبا میں دیو استبداد بن کر پائے کوب" ہیں اس لئے ان کو قیامِ امن کا ذمہ دار ٹھہرانا محض سینہ زوری ہے ------ اور سب سے بڑی وجہ تو اس انتشار کی یہ ہے کہ یہ عہد "بے خلیل" ہے!

یہاں اگر یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ مستقبلِ عالم کی تدبیر کی جائے۔ شاعر کا نظریہ مستقبل کے متعلق مطلقاً رجائیہ ہے اور ہونا بھی چاہئے۔ لیکن تدبیر مستقبل میں جو چیز ضروری ہے وہ یہ ہے کہ "ابتک ارتقائے حیات میں کچھ نقائص رہتے آئے ہیں جس کی وجہ سے اجتماعی زندگی میں افتراق صورت پذیر ہوتا رہا ہے۔ اب اگر انسان کی خواہش یہ ہے کہ وہ آئندہ اپنے بھائیوں کے ساتھ مل کر امن و

آسائش کی زندگی بسر کرے تو ہمارا یہ فرضِ اولیں ہے کہ ان تمام وجوہات کی نقاب کشائی کریں جو ازمنۂ قدیم میں ہمارے درمیان اشتقاق کا باعث رہی ہیں۔ تاکہ ہم اپنی اجتماعی زندگی سے اک نامحمود عنصر کی بیخ کنی کر سکیں، جو آجتک ہمیں اپنی حقیقت پہچاننے سے روکتی رہی ہے۔ اس طرح ہم ایک مکمل اجتماعی زندگی کی بنیاد ڈال سکیں گے!" اسی چیز کو شاعر نے "نویدِ انقلاب" اور "صلائے نو" میں بیان کیا ہے۔ لُبِ لباب یہ ہے ؎

خَتم ہو سکتی ہے یہ ہنگامہ آرائی ابھی ۔۔۔ ہو جو ان اقوام کو آئینِ فطرت کا لحاظ
کاش یہ انسان احساس اپنی عظمت کا کرے ۔۔۔ کاش ہو انسان کو اپنی ہی رفعت کا لحاظ!

"علت و معلول" کا حشر جو ہوگا وہ تو ظاہر ہے۔ یعنی دنیائے "غلامی خود غرضی، سرمایہ داری" اور جملہ علت ہائے شدید جو اس وقت اندر ہی اندر سوسائٹی کو گھن کی طرح کھائے جا رہی ہیں وہ "دن میں جوانی" کی نمود کے ساتھ باطل ہو جائیں گی، یہ سب اسی دم تک ہیں جبتک عصرِ نو میں "جوانی" پوری طرح جوان نہیں ہوتی، اس لحاظ سے "علت و معلول" تمام نظم کا خلاصہ ہے جس میں عمرِ نو کی "خصوصیات" اور پھر انکا "مداوا" دریا بہ حباب اندر کی شکل بند کیا ہے۔ ساتھ ساتھ مستقبل کی دلفریب جھلکیاں بھی عجب لطف دیتی ہیں۔

مستقبل کے مطابق وہی امید افزائیاں ہیں کہ ——

آسماں ہوگا سحر کے نور سے پھر جلوہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائیگی!

دہی دلاسے کہ شاہدِ فطرت ابھی اپنے جمال کی تکمیل میں مصروف ہے۔ تکمیل کے بعد خود بخود نقاب اُٹھ جائیگا تو تمام امتیاز ما و من مٹ جائیگا ــــــ یہ کشت و خونریزی، حرص و ہوس کی کارفرمائیاں، یہ ارباب سیاست کی صید افگنی ــــــ اور یہ سب کچھ جو "جادۂ منزل" ہو کر "منزل" کا فریب دے رہا ہے۔ سب کچھ "بزم عالم کے فروغ" میں ممزوج ہو کر تمام انانیت کو خیرباد کہہ دے گا، اور آخر کار

ایک دن دُنیا میں جنت بھی نمو پا جائیگی
ایک دن ہو کر رہے گا دورِ رنگیں کا نفاذ

انور مختار بی۔ اے۔ ایل۔ بی

ــــــ ✻ ــــــ

علیہیات :ــ

۱۔ اقبال اور سیاسیاتِ عالیہ۔ سید زبیر ایم۔ اے

۲۔ ہلڈرک کوزنز۔ بی۔ اے کیمرج۔ پراس اینڈ کانز۔ (Pros & Cons)

۳۔ "تہذیب کا ارتقا" (The Growth of Civilization (by W. G. Perry)

۴۔ رُوسو (The Social Contract)

عصرِ نو

(ہر بند بہ ترتیب حروف ابجد نظم کیا گیا ہے)

نمودِ عصر

پر تو خورشیدِ نو ہے دہر پر چھایا ہوا
ہے نئی کرنوں سے آج انسان چمکایا ہوا

آبیاری کر رہا ہی عصرِ نو انسان کی
پھر شگفتِ نو میں ہی ہر پھول مرجھایا ہوا

آج پھر اس کے بدن پر ہی نیا اک پیرہن
ہر طرف پھرتا ہی انساں آج اترایا ہوا

آج مستولی ہر اک شی پر ہی نیرنگِ شباب
رُخ چہرہ آرزو کی ضو سے مہکایا ہوا

آج ہر اک چیز پر انسان کی ہی دسترس
کامیابی سی دلِ انساں ہے گرمایا ہوا

پھر کناروں سے اُفق کے عصرِ نو ہی باریاب
آج ہے عہدِ کہن دُنیا میں گھبرایا ہوا

اک طرف آمد ہی عصرِ نو کی نازش درکنار
اک طرف عہدِ کہن جاتا ہے شرمایا ہوا

آج ہے انسان کے دل پر شبابِ آرزو
عصرِ حاضر کی دمک سی روپ ہی آیا ہوا

ہے اضافہ بحرِ ہستی میں نئی امواج کا
کل سمندر بن کے مانے گا یہ دریا آج کا

ارتقا

عالمِ انسانیت میں ہے نمودِ انقلاب
بڑھ رہا ہے رفتہ رفتہ عہدِ نو کا آفتاب

زندگی کی روح سی دنیا میں ہے دوڑی ہوئی
تازہ انسانیتِ کبریٰ پہ آیا ہے شباب

اٹھ رہی ہیں بزم سے جتنے تھے آئینِ کہن
اب نئے نغمے فضا میں ہیں نئے ساز و رباب

ہے حدودِ بزمِ امکاں پر نظر انسان کی
عصرِ حاضر کا جواں ہے بامراد و کامیاب

آج ہیں ماحول پُر عشرت فضائیں کیف بار
دیکھنے کی چیز ہے اس بزمِ نو کی آب و تاب

ذہنِ انساں پر ہے واضح آج جمعیت کا راز
انتشارِ بزمِ ہستی کا ہوا ہے سدِّ باب

آج قومیں بڑھ رہی ہیں ارتقا کی راہ میں
اجتماعی زندگی ہے بے حجاب و بے نقاب

ایک گوشہ بھی چمن کا آنکھ سے پنہاں نہیں
پردۂ فطرت میں ذہنِ آدمی ہے باریاب

آج ہر گوشے میں پہونچا ہے یہ فطرت کا خطیب
کل جو دور آنکھوں سے تھا وہ آج ہے دل سے قریب

نظریات

ذہنِ انساں نے کیے پیدا نئے اورنگ و تاج
اُڑ رہی ہیں ہر طرف پرچم نئے دنیا میں آج

ہیں نئے دستور و آئین اور سیاست بھی نئی
ٹوٹتے جاتے ہیں دنیا کے پرانے سب رواج

ڈھل رہی ہیں بت نئے انسانیت کے قصر میں
اور انساں دے رہا ہے ان ہیولوں کو خراج

قوتیں اب مختلف ہیں کارفرما دہر میں
ہو رہا ہے اک نئے عنوان سے دنیا میں راج

ہر کوئی ہے مدعی تعمیر اور تجدید کا
کیوں مقلد ہو کسی کا کوئی اہلِ احتیاج

کارفرما ہے سیاست میں ملوکیت کہیں
ہے کہیں فسطائیت رائج کہیں ہے سامراج

قائدیت اک طرف دیتی ہے دنیا کو پیام
نغمہ پیرا دوسری جانب ہے جمہوری مزاج

آج اس دنیا میں خاموشی کے معنی موت ہیں
آج بیداری کے معنی احتیاج و احتجاج

انقلاب انگیز ہے شورِ مسلسل کی گرج
اب نہیبِ صور سے ملتی ہے بادل کی گرج

نوجوان

آج ہے ہر نوجواں کے دل میں احساسِ نمود
ہے عمل کی درسگہ یہ رزمگاہِ ہست و بود

آج ہے اس عصرِ نو میں نوجواں آزاد کار
ٹوٹتی جاتی ہیں آئینِ کہن کی سب قیود

آج ہر تحریک کا عنواں ہیں یہ نوجواں
عظمتِ قوم و وطن ہے نوجوانوں کا وجود

آہنی قوت کا مالک ہے یہاں کا ہر جواں
بزمِ ہستی کے بکھیرے ہیں اسی نے تار و پود

نوجواں ہر قوم کے سرمایۂ محفوظ ہیں
ان کے دم سے قابلِ نازش ہے یہ بزمِ شہود

آج ان کے ذہن پر روشن ہیں دنیا کی رموز
ذہنیت نے ان کی طے کرلی ہیں ساری حدود

جادۂ علم و عمل میں نوجواں ہیں راہبر
باعثِ ہمت ہے قوموں کے لئے ان کا ورود

یہ اگر چاہیں پلٹ دیں تختۂ گیتی ابھی
ان کے ہاتھوں میں ہے دنیا کا نظامِ ہست و بود

ان سے قوت پا رہا ہے ملک و ملت کا سواد
نوجواں پائندہ باد و نوجوانی زندہ باد

عرش پر جب جا پہونچتی ہے جوانوں کی نگاہ
کھینچ کر لاتی ہے اپنے ساتھ سیلِ بے پناہ

کھیلتی ہیں بجلیوں کے ساتھ ان کی انگلیاں
دوڑتی ہے ہر کرن کے ساتھ ساتھ اُن کی نگاہ

نوجوانوں نے کیا تعمیر اک مندر نیا
اب نظر سے محو ہے ان کی پرانی خانقاہ

ان کی ذہنی زندگی ہے عصرِ نو پر حکمراں
کامیابی سے مرصع ان کے ہیں تاج و کلاہ

نوجواں امڈے چلے آتے ہیں یوں ہر سمت سے
جھوم کر چھا جائے جیسے چرخ پر ابرِ سیاہ

نوجوانوں کے لئے سب کچھ ہے صرف ان کا شباب
ان کے آگے ہیچ ہے فرقِ گدا و بادشاہ

زلزلوں سے کانپ اٹھتی ہیں زمین و آسماں
گونجتی ہیں ان کے نعرے جب فضا میں گاہ گاہ

صرف روشن پہلوؤں پر ان کی رہتی ہے نظر
یاس و غم کا ابتلا ہے ان کے مذہب میں گناہ

پستی و دوں ہمتی سے آج بیگانہ ہیں یہ
ان کے دل ہیں آئینہ، خود آئینہ خانہ ہیں یہ

عزائم

اک نیا آئین بنانے کی مجھے ہے آرزو
ہو نیا ساقی نئی محفل نئے جام و سبو

ایسی قومیت کی دیواریں کروں گا استوار
جس کی بنیادوں میں بھر دونگا جوانوں کا لہو

اک نئی دنیا کی ہے تعمیر میرے ذہن میں
اک جہانِ تازہ کی میں کر رہا ہوں جستجو

اس چمن میں ہوگا جب آزاد انساں گامزن
جنّتِ نظّارہ ہوگی ہر فضائے رنگ و بو

دورِ محکومی کو عصرِ نو سے میں دوں گا نکال
نسلِ انسانی کو حاصل ہو گی اک فطری نمو

ہر جماعت کے لئے مخصوص ہوں گے کچھ حقوق
لازمی ہوگی یہاں انسانیت کی آبرو

خود بخود افراد کی مٹ جائے گی محکومیت
نوجواں ہر قوم کا بن جائے گا جب شعلہ خو

عصرِ نو میں گائے گا ہر شخص آزادی کے گیت
جس طرح ہو وادیوں میں نغمہ پیرا آبجو

سازِ آزادی بناؤنگا میں برگ و بار کو
اذن دونگا رقص کرنے کا ہر اک کہسار کو

نسائیت

ہے تجلّی عہدِ نو کی دہر میں جلوہ طراز
ہو رہا ہے روحِ انسانی میں پیدا اہتزاز

اک طرف ہیں نوجوانوں کی شجاعت شعلہ بار
اک طرف قصرِ شجاعت کے ہیں قصّے دل نواز

اک طرف ہے مرتعش گویا حرم کی آبرو
اک طرف نسوانیت کے دل میں پیدا ہے گداز

غیر ممکن ہے نسائیت ہو اب خانہ نشیں
غیر ممکن ہے کرے وہ عصرِ نو سے احتراز

بحر میں رہ کر کوئی موجوں سے بچ سکتا نہیں
منکشف ہے ہر حقیقت آشنا دل پر یہ راز

مختصر ہنگامۂ ہستی کا ہے یہ اقتضا
کوئی رہ سکتا ہے کیونکر عصرِ نو سے بے نیاز

اب گیا وہ وقت جب عورت تھی صیدِ آرزو
اب گیا وہ وقت جب عورت تھی صرفِ حرص و آز

اب زمانے کی حقیقت پر بھی ہے اس کی نگاہ
اب وہ بن سکتی نہیں صرف آلۂ اہلِ مجاز

اب ضمیر و نفس میں تمیز ہے جرأت فروز
فطرتِ نسوانیت ہے آج حرّیت فروز

آج ہے بیدار عورت بھی بہاروں کی طرح
اس کے دل میں سوز پیدا ہے شراروں کی طرح

آج عورت کو نہ ہو کیوں عظمتوں کا اپنی پاس
اپنی ہستی میں اٹل ہے کوہساروں کی طرح

اس کے دم سے قوم پر ہے بارشِ لطف و کرم
آج ہے ضو افگنی اسکی ستاروں کی طرح

قوم کے ہر فرد پر لازم ہے اس کا احترام
باعثِ عزت ہے یہ بھی تاجداروں کی طرح

منتشر اجزائے عالم کو کرے گی متحد
اسمیں بھی جولانیاں ہیں آبشاروں کی طرح

زندگی کی شورشوں پر مائلِ تنقید ہے
اور پُر غیظ و غضب ہے شعلہ کاروں کی طرح

زندگی کی برہمی سے اب نہیں یہ مطمئن
آج ہے بے چین یہ بھی برق زاروں کی طرح

قوم کے زخموں پہ رکھتی ہے نگاہِ دل نواز
بخش دیتی ہے یہ تسکیں غمگساروں کی طرح

اس کے دم سے قوم میں ہوتا ہے پیدا انشراح
منحصر ہے اس کی قوت پر وطن کی ہر فلاح

سرمایہ داری

قوتِ سرمایہ داری میں ہے پیدا انحطاط
چہرہ مزدور پر جھلکی شعاعِ انبساط

عہدِ حاضر کا تقاضا ہے کہ ہو جا ہوشیار
اے علمبردارِ سرمایہ بہ ہوش و احتیاط

جن کی قسمت آشنائے شورش و آلام تھی
عہدِ حاضر میں انہیں کے واسطے اب ہے نشاط

کیوں نہ ہو لعنت فزا سرمایہ داری کا رواج
گر یہی ہے لازمی ہے اک اصول و انضباط

غیر ممکن ہے فضائے دہر ہو تسکیں بدوش
مختلف طبقات میں پیدا نہ ہو گر اختلاط

کاش انساں متحد ہو کر کریں حاصل سکوں
جیسے شب کو چرخ پر بچھتی ہے تاروں کی بساط

صنفِ نازک ہوں، جو مزدور اور جمہور دوست
ہے انہیں کے دم سے دنیا میں سکون و انبساط

غیر ممکن ہے کہ حاصل ہو زمانے کو نجات
عہدِ حاضر سے اٹھا لیں یہ اگر اپنی بساط

ہے تفرق سے امیدِ نظم آرائی غلط
منتشر رہ کر یہاں ہے خبطِ یکجائی غلط

مزدور

آ بتاؤں میں تجھے حالت ہے کیا مزدور کی
آ دکھاؤں میں تجھے پُر درد اس کی زندگی

کس طرح اسکو رہا سرمایہ داری سے نیاز
کس طرح مزدور نے کی محفلوں میں خواجگی

کس طرح انسان کی وہ ٹھوکریں کھاتا رہا
جانور کی سی بسر کی اسنے کیونکر زندگی

آ بتاؤں کس طرح آلام وہ سہتا رہا
آ دکھاؤں آج اُس کے تیوروں کی برہمی

اس قدر ناقابلِ برداشت تھا دردِ والم
چیخ اُٹھا تھا غمِ ایام سے مزدور بھی

آج ہیں مزدور کی طاقت کے چرچے ہر طرف
آج ہے مزدور اک قوت یہاں بڑھتی ہوئی

غیر ممکن ہے کوئی ٹھکرا سکے اس کا وجود
غیر ممکن ہے کوئی اس سے کرے پہلو تہی

غیر ممکن ہے رہے اس سے زمانہ بے خبر
غیر ممکن ہے کہ اب مزدور سو جائے کبھی

ہر نئی تحریک میں ہے یہ شریکِ لازمی
آج ہے مخدومیت اندوز ذہن خادمی

اشتراکیت

عہدِ حاضر ہے جو کرتا ہے جہاں میں اشتراک
اس کا مستقبل یقیناً ہے عظیم و تابناک

جو جماعت پستیوں کی اپنی ہو احساس مند
خود ہی کرتی ہو جو اپنی ظلمتوں کا پردہ چاک

جس جماعت کے لئے اک مرکزِ تنظیم ہو
قوتِ تدبیر ہو جسکی بہت اندیشناک

ایک ہی منزل کی جانب جو جماعت ہو رواں
اُس کی قوت کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے خاک

آج ہے مزدور کو احساس خود تنظیم کا
آج ہے شائستۂ تحسین اسکا انہماک

ایک دن مزدور کو یہ زندگی اک عار تھی
ایک دن تھا اسکی حالت تھی بہت ہی دردناک

آج ان مزدور کو کوئی گرا سکتا نہیں
آنکھ بھی اس سے ملانے میں ہے اب لوگوں کو باک

آج ان مزدور کو سر پر جگہ دیتے ہیں سب
آج ہے مزدور کے قدموں کی مٹی خاکِ پاک

ہمتِ مزدور میں اب ہے ترقی کی جھلک
ہے روش سے اسکی پیدا پیش قدمی کی جھلک

سیاست

وہ نظر آیا فلک پر عصرِ حاضر کا ہلال
وہ چمک اٹھا خوشی سے چہرۂ حزن و ملال

اک طرف طبقات میں پیدا ہے بیداری کی موج
دیدنی ہے دوسری جانب سیاست کا کمال

اک طرف جمہور کی طاقت کے چرچے ہیں یہاں
دوسری جانب حکومت کر رہی ہے قیل و قال

ہے سیاست کا تسلط ذہنِ انسانی پر آج
جانبِ مذہب نہیں مبذول انساں کا خیال

ہے سیاست کی روش پر آج انساں گامزن
آج ضمنی ہو گیا ہے دوسرا ہر اک سوال

اک طرف سمٹا ہوا ہے راہبِ گوشہ نشیں
اک طرف مرعوب کُن اہلِ سیاست کا جلال

آج رخصت ہو رہی ہے ذہن سے روحانیت
مادیت کے اشاروں پہ ہے نظمِ ماہ و سال

اک طرف سرمایہ داروں نے بنایا ہے محاذ
دوسری جانب ہے مزدوروں کی روٹی کا سوال

نظمِ عالم کا بہ اندازِ دگر ہے آجکل
جذبۂ انسانیت پھر جوش پر ہے آجکل

قائدیت

آج کل زرغے میں ہے دنیا کا جمہوری نظام
جن اداروں کی ہوئی ہے پرورش صدیوں کے بعد
زندگی کے سارے شعبوں پہ ہے اس کا اقتدار
زندگی ہے اس کی نظروں میں فقط اک سنسنی
قائدیت کی نگاہیں ہیں ہمیشہ حال پر
عہدِ انسانی میں اٹھی ہیں ہزاروں آندھیاں
قائدیت کھیلتی ہے قوم کے افراد سے
بجھ نہیں سکتا کبھی لیکن یہ جمہوری چراغ

ہے ہوائے شخصیت میں قائدِ نخوت خرام
ایک لمحے میں ہوا جاتا ہے اُن کا اختتام
آج کل قائد کے ہاتھوں میں ہے ہستی کی لگام
زندگی کا چاہیے آٹھوں پہر گردش میں جام
ہاں نہیں مستقبلِ عالم سے اسکو کوئی کام
یادگارِ بربریت ہے ابھی تک ان کا نام
اک کھلونا ہیں فقط اسکی نگاہوں میں عوام
اسکی ضو افشانیوں کو اب بھی حاصل ہے دوام

قائد و جمہوریت دست و گریباں ہیں بہم
گیر و دارِ محشرِ ہستی کے ساماں ہیں بہم

قائد

قابلِ نظّارہ ہے قائد کا لیکن بانکپن
آسمانِ روح پر اس کا ہے تارہ ضوفگن

آج کل ہے شخصیت میں اُسکی اتنی دلکشی
آجکل وہ زینتِ محفل ہے، صدرِ انجمن

خون میں اُٹھتی ہیں اُس کے ذکر سے جولانیاں
اُس کے دم سے غیرتِ قوم و وطن ہے، جوش زن

وہ اٹل ہے اپنے جذبوں میں پہاڑوں کی طرح
اس کے آگے ہیچ ہیں دنیا کے سب رنج و محن

قلبِ دشمن میں ہے اس کے نام سے خوف و ہراس
رعبِ شخصیّت سے کانپ اُٹھتا ہے اس کے اہرمن

جو ارادہ کرلے اس سے وہ کبھی ٹلتا نہیں
وہ عمل کا مرد ہے راہِ عمل میں گامزن

وہ ہے سرخوش تو زمانے پر ہے طاری سرخوشی
اس سے وابستہ ہے یہ شادابیٔ دشت و چمن

لیکن اس قائد کو دنیا میں نہیں حاصل دوام
زندگی تک اُسکی ہے یہ طمطراقِ ما و من

اٹھ گیا قائد تو پھر اسکی بقا کچھ بھی نہیں
قائدیت اک بگولے کے سوا کچھ بھی نہیں

جمہوریت اور قیادت

ہو اگر جمہوریت کو اپنی خودداری کا پاس
قائدِ مغرور کے کچھ ٹھیک ہوں ہوش و حواس

ہے مگر جمہوریت خود آج مغلوبِ ریا
دل میں فسطائی ارادے، تن پہ جمہوری لباس

قائدیت کو بھروسہ ایک واحد ذات پر
مختلف طبقات پر جمہور کی قائم اساس

اجتماعی زندگی کی انتہا جمہوریت
قائدیت کی بنا، وحشت، جنون، خوف و ہراس

ذہنیت انسان کی طے کر چکی ہے سب حدود
لیکن اب تک دہر کو جمہوریت آئی نہ راس

چند قرنوں میں بناتی ہے مکاں جمہوریت
ایک جابر اٹھ کے وہ تعمیر کر دیتا ہے ناس

ایک مدت سے سیاست کا یہی دستور ہے
ہیں کبھی روشن امیدیں اور کبھی ظلماتِ یاس

ہوتی آئی ہے یہاں تخریب بھی تعمیر بھی
ہیں کبھی کھیتوں میں گلشن اور کبھی اگتی ہے گھاس

آشیانہ ہے کبھی لازم کبھی کنجِ قفس
عالمِ اضداد ہے گلزارِ عالم اور بس

امن و جنگ

کاش یہ انسان بزمِ جنگ کو کہہ دے وداع
جس سے نوحے ہوں رواں اُس جنگ کو کہہ دے وداع

کاش اسکی ذہنیت ہو مائلِ امن و سکوں
کاش یہ گرمیِ آب و رنگ کو کہہ دے وداع

کاش یہ فطرت سے سیکھے ملتفت ہونے کا راز
کاش یہ تیر و تفنگ و سنگ کو کہہ دے وداع

قومیت ہو یا وطن کا جذبہ مردود ہو
قوم خود غرضی کے ہر اک ڈھنگ کو کہہ دے وداع

ہر قدم پر اک نئی وسعت نظر افروز ہو
طالبِ وسعت قبائے تنگ کو کہہ دے وداع

کہہ سکے انساں اگر شور و غوغا کو خیرباد
پھر تو یہ خود ہی نظامِ جنگ کو کہہ دے وداع

عصرِ حاضر میں نمو پا جائیں نظریاتِ نو
کاش یہ انسان ذہنِ تنگ کو کہہ دے وداع

شر کا باعث ہی یہ پابندیِ قوم و وطن
خود غرض انسان نام و ننگ کو کہہ دے وداع

بے سکونی کی حدوں سے دور تسکیں ہو شروع
دہشت مٹ جائیں تو اک ماحولِ رنگیں ہو شروع

جدید رجحانات

کہہ رہا ہے آج یہ ہم سے زمانہ صاف صاف
چل نہیں سکتا کوئی انساں زمانے کے خلاف

ٹوٹتے جاتے ہیں جو بھی دہر کے رسم و رواج
آج ہر ایوانِ مستحکم میں پیدا ہے شگاف

خود بخود پیدا ہوئے جاتے ہیں تازہ نظریے
کر نہیں سکتا کوئی انسان اب ان سے انحراف

ذہنِ انساں ہیں واضح آج جتنے ہیں نکات
اُٹھ رہا ہے ذہن سے گویا جہالت کا غلاف

فضویت ہو کہ ہو وہ اشتراکی نظریہ
سب کا مقصد ہے حقِ انسانیت کا انکشاف

کچھ یہ کہتے ہیں کہ ہے بے روح جمہوری نظام
کچھ سمجھتے ہیں حکومت کو فقط لاف و گزاف

ملتیں جو ہیں یہاں جمہوریت سے منحرف
ان کی لغزش کو زمانہ کر نہیں سکتا معاف

غیر ممکن ہے کہ حاصل ہو حکومت کو دوام
وہ حکومت جو حقِ انسانیت کے ہو خلاف

ہے حقِ انسانیت ہی دہر کا عنوان صرف
ہیں انھیں کے واسطے دنیا کا یہ سامان صرف

زندگی ہے حرص، یہ سب عیب صبح بیکار حرص
حرص ہے دنیا کی ہر شے اور کاروبار حرص

جنگ و شورش پر جو آمادہ یہاں اقوام ہیں
ان میں جلوہ گر ہوس ہے اور ہے بیدار حرص

ان کو لے ڈوبے گا اک دن جذبۂ حرص و ہوس
خود غرض قوموں کو ہے سرمایۂ ادبار حرص

جن کے کشکولِ سیاست میں بھرا ہو افتراق
ان کو اکساتی ہے شورش پر یہاں ہر بار حرص

حرص کا جذبہ ہی کر دیتا ہے قوموں کو تباہ
سینۂ ہستی پہ ہے گویا بڑا اک بار حرص

آگے بڑھنے ہی نہیں دیتا کسی کو یہ جنوں
شورشِ زحمت کا باعث، درپئے آزار حرص

زندگی کی راہ میں پھر وہ نہیں پاتیں عروج
جب کبھی قوموں میں ہوتا ہے علم بردار حرص

ہر طرف آتی ہے دنیا میں نظر آگ اور خون
گر کبھی دنیا میں ہو جاتی ہے شعلہ بار حرص

اپنے بندوں کو گرانا حرص کا ہے کام خاص
ہیں گرفتارِ مصائب اس کے ہاتھوں عام خاص

آرزو

کاش دنیا میں مرتب ہو کوئی ایسا وفاق
دُور کر دے جو خدائی سے نفاق و افتراق

کاش ہو اقوامِ عالم میں نیا اک اتحاد
کاش رکھدی جائے جنسِ قومیت بالائے طاق

کاش دنیا میں ہو قائم اک نئی جمہوریت
بھول ہی جائے کاش دنیا جابروں کا طمطراق

کاش ہو آئینِ فطرت پر کبھی ان کی نظر
دُور ہو جائے کسی صورت یہ قوموں کا نفاق

اب زمیں انسان کی دیوانگی سے تنگ ہے
قلبِ گیتی پر یہ دستورِ کہن ہے آج شاق

نو بنو جس ساز سے نغموں کی آتی ہو صدا
اب کہاں ہے دہر میں اس سازِ الفت کا مذاق

آج انساں پر کوئی منظر نہیں ہے کیف بار
آج ہی اُلجھی ہوئی ہے اس کی نگاہِ اشتیاق

شورشیں پیوند ہیں انسان کی تخلیق میں
کس طرح انساں گوارا کر سکے ان کا فراق

یا تو انساں کو دیا جائے محبت کا سبق
یا کوئی فطرت کو دے تجدیدِ خلقت کا سبق

جنگ و غا

بڑھ چکا ہے زندگی کی راہ میں گو اس قدر
آہ لیکن پھر بھی یہ انسان ہے شوریدہ سر

چاہتا ہے ساری دنیا پر ہو اس کا اقتدار
ایک مرکز پر نہیں قانع کبھی اس کی نظر

جاگ اٹھتا ہے کبھی جب جذبۂ حیوانیت
جادۂ انسانیت سے پاؤں جاتے ہیں گذر

اپنی ہستی تک ہی رہتا ہے یہاں اس کا مفاد
یعنی ہو جاتی ہیں خود اس کی نگاہیں مختصر

جذبۂ حرص و ہوس کا ہو تسلط جب کبھی
پھر کسی تحریک کا ہوتا نہیں اس پر اثر

وضع کر لیتا ہے قومی اور نسلی امتیاز
جس سے انسانی حمیت بھاگتی ہے چونک کر

جیسے انسانوں سے بڑھکر قیمتی ہیں نظریات
اس لئے چھڑتی ہے جنگ انسانیت کے نام پر

ذہنِ انساں پر اثر کر جائے جب دیوانگی
پھر نہیں رہتا اسے دنیا میں ہوشِ خیر و شر

ہے بجائے خود مصیبت ذہنیت کا انتشار
دیکھئے کب ختم ہو انانیت کا انتشار

حرب و ضرب

شاد باش ای جنگِ عصرِ حاضرہ آباد باش
تو نے اس تہذیبِ حاضر کا کیا ہے پردہ فاش

بہرِ خوں خواری اسے کچھ وسعتیں درکار ہیں
ہر گھڑی انساں کو اک صیدِ نو ہے کی تلاش

اس طرح کمزور قوموں کو غلامی ہی سے خوف
جیسے گھر جائے گِدھوں میں گربۂ مسکیں کی لاش

زیر دستوں کو یہاں جینے کا کوئی حق نہیں
رازقِ مطلق یہ گویا بار ہے ان کی معاش

قومیت کے نام سے وابستہ کر کے جنگ کو
خود غرض کرتے ہیں پیدا قومیت میں ارتعاش

چھین کر آزادیاں تہذیب پھیلاتے ہیں یہ
مدعی تہذیب کے ہیں در حقیقت بد قماش

آسماں سے آگ برساتے ہیں طوفانی جہاز
جذبۂ حیوانیت کو اس طرح کرتے ہیں فاش

آج جو کمزور ہیں مٹ جائیں گے وہ کل ضرور
کوئی ان مظلوم قوموں کو یہ دے پیغام کاش

اب نہ یہ محفل کی زینت ہیں نہ ہیں لدادِ دوش
عصرِ نو میں ان کی ہستی ہے فقط اک بارِ دوش

تدبیر و تعمیر

ملتِ کمزور پر ہے تنگ ساری کائنات
دیوِ استبداد کے پنجے میں ہے اس کی حیات

ذہن جس کا ہو یہاں جنگ و وغا سے آشنا
عصرِ نو میں ہے فقط اُس قوم کو حاصل ثبات

دہر کی ہر قوم پر طاری ہے اُس کا رعب و داب
ملتفت اُس سے زمانے کی ہے چشمِ التفات

حسبِ خواہش فتح جو قومیں بجاتی ہیں رباب
اُن کے ہی الفاظ سے معمور ہے اُنکی لغات

جس طرح چاہیں مرتب وہ کریں تاریخ بھی
یاد رہتی ہے زمانے کو اِنھیں قوموں کی بات

ذہنِ انساں پہ مسلط ہیں یہی جبتک اصول
غیر ممکن ہے ملے کمزور قوموں کو نجات

پھر نئے سر سے مرتب ہوں یہاں آئینِ نو
متحد ہو جائے دُنیا میں جو کمزوروں کی ذات

عصرِ نو میں ان کو حاصل ہو نئی آسودگی
ان کی مرضی سے مرتّب ہو جہانِ ممکنات

ہر طرف آزاد اور آباد ہو انسانیت
اقتدارِ عالمِ ایجاد ہو انسانیت

انبائے عصر

کس قدر انساں میں شوریدگی ہے الغیاث
آج فطرت میں یہ کیسی برہمی ہے الغیاث

عہدِ نو کے نام پر جاری ہے پیہم کشت و خوں
یہ بھی کوئی زندگی میں زندگی ہے الغیاث

اک طرف جمہوریت سے ہے مدد کی آرزو
اک طرف جمہور سے پہلو تہی ہے الغیاث

اک طرف جمہوریت کے نام پر اعلانِ جنگ
اک طرف اعمالِ عالم میں خودی ہے الغیاث

کام آئیں عصرِ حاضر کی نہ یہ بیداریاں
آج تاریکی سے بدتر روشنی ہے الغیاث

کس طرح انساں کی تجدید کا آئے یقیں
کس طرح کہہ دوں میں یہ دنیا نئی ہے الغیاث

عصرِ حاضر کا تصور خواب بے معنی ہوا
عہدِ نو کی کشمکش میں آدمی ہے الغیاث

بادۂ تسکیں سے خالی ہے یہ میخانہ تمام
ہر طرف اس دہر میں تشنہ لبی ہے الغیاث

یاس کہتی ہے کہ اُمیدِ ترقی ہے عبث
آس کہتی ہے کہ مایوسی تمہاری ہے عبث

نویدِ انقلاب

کل تھا اس سعی ساٹھی میں انتشار و انفساخ
آج ہے آثار سے پیدا نشاط آگیں فراخ

دیر تک انسانیت مظلوم رہ سکتی نہیں
تا ابد قائم رہیں گے کیا یونہی ایوان و کاخ ؟

عصرِ حاضر دے رہا ہے اک نویدِ انقلاب
ٹوٹ کر گرنے کو ہے اب نخوت و ثروت کی شاخ

گو نہیں آسان انساں زار میں تبدیلیاں
عصرِ حاضر سہل کر دیگا یہ کارِ سنگلاخ

گو خرابِ خلفشار اسوقت ہے سارا نظام
خون میں اور آگ میں دہکی ہوئی جیسے سلاخ

پھر بھی اب کوئی غریبوں کو سلا سکتا نہیں
کام آسکتا نہیں سرمایہ داری کا طباخ

دہر میں انسان آزادی کا ہوگا شیفتہ
خود بخود حاصل کریگی نسلِ انسانی فراخ

ہو گی ساعی کوششِ پرواز میں قومِ نحیف
باغ میں نشو و نما پائیگی اب کمزور شاخ

کشت و خوں کے کر دیے جائیں فنا سامانِ سرخ
صرف "آزادی" کا لکھا جائے اک عنوانِ سرخ

نوائے مستقبل

ایک دن ہو کر رہے گا ایسے آئیں کا نفاذ
جس سے اِس دُنیا میں ہو دستورِ تسکیں کا نفاذ

اِس طرح انسانیت کو پھر ملے گی روشنی
باغ کی ہر اک رَوِش پر ہو گا تزئیں کا نفاذ

دہر کی ہر قوم ہو گی اک لڑی میں منسلک
ہر طرف ہو گا دساتیرِ نگاریں کا نفاذ

محفلِ عالم میں ہر سو روشنی ہو جائیگی
کاہ سے تا ماہ ہو گا امن و تمکیں کا نفاذ

ایک دن دُنیا میں جنت بھی نمو پا جائیگی
ایک دن ہو کر رہے گا دورِ رنگیں کا نفاذ

اِس طرح انسان چمکے گا بساطِ دہر پر
گلشنِ بخشندہ میں ہو جیسے نسریں کا نفاذ

عالمِ انسانیت میں ہو گی جلوہ افگنی
جس طرح شب کو فلک پر ماہِ پرویں کا نفاذ

قومیت انسانیت سے متحد ہو جائیگی
ہو گا ہر سو جلوۂ پُر نور و شیریں کا نفاذ

ہو گا اِس نکھری ہوئی دُنیا کا ہر منظر لذیذ
جس طرح ہوں اک جگہ شیر و شکر مِلکر لذیذ

علت و معلول

دُور ہو جائے جو دنیا سے غلامی کا مرض
خود بخود مٹ جائے یہ اندوہ ناکی کا مرض

اک طرف دنیا کی دولت پر تسلط کا جنوں
اک طرف قوموں کو ہے سرمایہ داری کا مرض

ہے ادھر مذہب کی قوت ختم ہو جانے کا غم
مادیت کو ادھر ہے ضو فشانی کا مرض

اک طرف کمزور قوموں کو کچل دینے کی دُھن
اک طرف ہے جابروں کی غمگساری کا مرض

قومیت پر مطمئن ہو جائیں سب قومیں اگر
دُور ہو سکتا ہے اب بھی تشنہ کامی کا مرض

آج مردہ جسم میں ہے زندگانی کی نمود
موت کو لاحق ہوا ہے زندگانی کا مرض

اک طرف طاقتوروں کا ذہن بامِ عرش پر
اک طرف مظلوم کو ہے انکساری کا مرض

آسماں پرواز ہونگی عصرِ نو میں ملتیں
جن کو کھائے جا رہا ہے خاکساری کا مرض

عصرِ نو ہے اک نویدِ زندگانی الغرض
از سرِ نو واپس آئیگی جوانی الغرض

صلائے نو

نوجوانوں کو اگر ہو قوم و ملت کا لحاظ
ہو اگر مزدور کو محنت مشقت کا لحاظ

عصرِ نو کی عرش پر پہونچیں نئی تابانیاں
کارفرما ہو جو ذہنوں میں مروّت کا لحاظ

حکمرانوں کو اگر ہو امن اور تسکیں کا پاس
خود بخود مٹ جائے جنگ و بربریت کا لحاظ

ختم ہو جائے یہ سب ہنگامہ آرائی ابھی
ہو اگر اقوام کو آئینِ فطرت کا لحاظ

وہ جماعت ہو گی عصرِ حاضرہ میں جلوہ بار
جس جماعت کو رہا اپنی حقیقت کا لحاظ

صبحِ منزل آئیگی کیونکر نظر اُس قوم کو
دہر میں جس کو نہیں ہے نور و ظلمت کا لحاظ

عصرِ نو کی قوتیں آجائیں گر بروئے کار
خود بخود دنیا کرے دنیا کی عظمت کا لحاظ

کاش اس انسان کو انسانیت کا پاس ہو
کاش ہو انسان کو اپنی ہی رفعت کا لحاظ

قسمتِ کام و دہن ہو بادہ سامانی کا خط
دہرِ کہنہ پھر اٹھائے کیفِ انسانی کا خط

مستقبل عالم

ارتقا پرداز ہے ہر وقت انساں کا دماغ ضوفشاں ہر لحظہ ہے اسکی ترقی کا چراغ

خود غرض قوموں کی یہ خود غرضیاں مٹ جائینگی قسمتِ اقوام ہوگا امن و تسکیں کا فراغ

بزمِ ہستی ہی انھیں کی ذات سی ابتک خراب خود غرض قومیں ہیں گویا سینۂ ہستی پہ داغ

نوجواں لائینگے اپنی قوتیں جب کام میں محفلِ ہستی نظر آنے لگے گی باغ باغ

جگمگا اُٹھے گا انساں بزمِ ہست و بود میں چاند بن جائیگا اکدن آدمیت کا چراغ

یہ وطن اور قوم کی تخصیص سب مٹ جائیگی اجتماعی زندگی سی پائیگا تسکیں دماغ

ایکدن انسانیت پر چھائینگی تابانیاں آتش افزا رنگِ گل سے جسطرح ہو صحنِ باغ

دہر میں جمہوریت کے گیت ہونگے کیف بار کیف کے نغموں سے پھر معمور ہوگا ہر ایاغ

اے ضیاؔ پیشِ نظر ہے نسلِ آدم کا فروغ
عصرِ نو کی ہر ادا ہے بزمِ عالم کا فروغ